© rasailojaraid.com

نقطۂ نظر

علمِ تفسیر کی تنقید
(CRITIQUE OF TAFSEER)

جناب خضر یسین صاحب

علم حقیقت کا بلا واسطہ فہم ہے بایں طور یہ ہمارے دیگر ادراکی قویٰ (COGNTIVE FACULTIES) یعنی خیال، رائے اور مفروضہ سے بالکل منفرد و متمیز استعداد ہے، خیال، رائے اور مفروضے کا تعلق انسان کے عقل محض سے ہے لیکن علم میں انسان کا عقل کسی حقیقت کا ادراک کر رہا ہوتا ہے۔ کسی حقیقت کا فہم حاصل کر رہا ہوتا ہے، یہ حقیقت جس کا فہم علم کہلاتا ہے ناظر کے روبرو ہوتی ہے، اس حقیقت کا وجود ناظر کے ادراک سے قبل موجود ہوتا ہے، ناظر اس حقیقت کا ادراک حاصل کرتا ہے تو اپنے منظور (OBJECT) پہ حکم لگاتا ہے، کہ منظور (OBIECT) یہ ہے یا وہ ہے۔ یعنی قلم ہے کتاب ہے، ناظر (SUBTECT) کا یہ حکم کہ منظور قلم ہے یا کتاب ہے، نہ خیال ہے اور نہ ہی رائے ہے اور اسی طرح یہ مفروضہ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ حقیقت ہے، یہ سچائی ہے، یہ صداقت ہے، یہ ناقابلِ انکار صداقت ہے، قلم واقعتاً قلم ہے، کتاب واقعتاً کتاب ہے، گویا علم حقیقت کی نسبت ایسا قضیہ ہے جس کے متوازی خارج میں حقیقت بالکل ویسی ہی موجود ہوتی ہے جیسی کہ قضیہ میں بیان کی گئی ہے۔

علم کی وہبی شرائط (APRIORI CONDITIONS) ناظر اور منظور ہیں، علم ان دو کے مابین ربط کا نام ہے، سوال یہ ہے کہ ان دو کی کیا خصائص ہیں جن کے ہوتے ہوئے علم وجود پذیر ہوتا ہے، ناظر کے پاس دو ایسی استعدادیں ہیں جن کے عمل میں آنے سے علم متحقق ہوتا ہے۔

نمبر ا حواس (SENSES): یہ ایک ایسی استعداد ہے جو موجود فی الخارج کا ادراک کرتی ہے، ادراک بالحواس کے متحقق ہونے کی شرط زمان و مکان ہیں، جب تک کوئی حقیقت زمانی مکانی نہ ہوگی ہمارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حواس اس کا ادراک حاصل کرنے سے قاصر رہیں گے، گویا زمان و مکان کی شرط کو قبول نہ کرنے والی حقیقت کے ادراک کی ذمہ داری ہمارے حواس پر نہیں ڈالی جاسکتی۔

نمبر۲ عقل (REASON)

یہ ایک ایسی استعداد (FACULTY) ہے جو تصوّر قائم کرتی ہے اس کا ادراک، کلی اور لازمانی و لامکانی یعنی قدیم (ETERNAL) ہوتا ہے یہ ہمارے ادراک بالحواس پر حکم لگاتی ہے، ادراک بالحواس کے بغیر تصوّر عقلی بالکل بے معنی ہوتا ہے۔ ایسا تصوّر جو ادراک بالحواس کی تنظیم نہ کر رہا ہو ناظر کا خیال ہوتا ہے، جس کی نسبت یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے مقابلے میں حقیقت ہے اور ویسی ہی ہے جیسی کہ خیال میں آئی ہے جبکہ علم کے لیے ضروری ہے کہ اس کے متوازی حقیقت موجود ہو اور بالکل ویسی ہی موجود ہو جیسی کہ قضیے میں بیان کی گئی ہے، اب محض ادراک بالحواس بھی علم نہیں ہے اور نہ ہی محض عقلی تصوّر علم ہے بلکہ علم ان دونوں استعدادت کی تالیف سے وجود میں آتا ہے۔

منظور (OBTECT) ایک حقیقت ہے جس میں دو خصوصیات ہیں۔ ایک صُورت (FORM) اور دوسرا المحتویٰ (MATTER) ان دو خصائص کے ادراک کے لیے ناظر اپنی دو الگ الگ استعدادات کو عمل میں لاتا ہے، صُورت (FORM) کا ادراک عقل سے کرتا ہے اور محتویٰ (MATTER) کا ادراک حواس کے ذریعے سے حاصل کرتا ہے، مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوگیا ہے کہ علم ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے جس کے صحیح ہونے کا دعویٰ ادراک بالحواس کے ذریعے سے ثابت کیا جاسکتا ہے اور اسی کے ساتھ ہی ہم خود اس نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں کہ ورائے حواس حقیقت کے علم کا کوئی امکان نہیں ہے۔

علم کی تقسیم باعتبار وظیفہ

(DIVISION OF KNWLEDTE BYITS FUNCTION)

ماقبل مقدمہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ علم حقیقت کے تعلق میں ایک تصدیق ہے۔ ایک قضیہ ہے، جو حقیقت کے بالکل عین مطابق ہوتا ہے، قضیہ دو اجزا پر مشتمل ہوتا ہے، I محکوم بہ (SUBTECT) وہ حقیقت ہے جس کا علم حاصل کرنا مطلوب ہے اس کو موضوع کہتے ہیں II محکوم بہ (PREDICATE) یہ وہ بیان ہے جو موضوع پر حکم ہے، اگر محکوم بہ موضوع کی وضاحت کرے تو علم کی نوعیت تحلیلی (ANALYTICAL) ہوگی اور اگر موضوع کی وضاحت کے بجائے موضوع کی نسبت ہماری بصیرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اضافہ کر رہا ہو تو علم کی نوعیت تالیفی (SYNTHETICAL) ہوگی، اسی فرق کو پیش نظر رکھتے ہوئے علم کی دو اہم اقسام پہ قدرے صراحت سے بحث کی جاتی ہے۔

تحلیلی علم (ANALYTIC SCIENCE)

اگر علمی جستجو کا مدعا اپنے موضوع کو فقط واضح کرنا ہو اور موضوع کے بارے میں کوئی ایسی بصیرت فراہم کرنا نہ ہو جو موضوع کے ذہنی مضمرات کے علاوہ ہو تو علم کی نوعیت تحلیلی ہوتی ہے اس لیے یہ علم تحلیلی ہوتا ہے، یہ علم ہمیشہ عقلی (Rational) ہوتا ہے نیز اس علم کا تعلق بیان سے ہوتا ہے، یعنی موضوع لازماً ایک بیان ہوگا جو غیر واضح ہوگا مبہم ہوگا، اور بیان کے سوا کچھ نہیں ہوگا، اب اس کو ایک مثال سے سمجھئے، ہم کہتے ہیں کہ:

تمام اجسام متحیز ہوتے ہیں، یا، علم ناظر اور منظور کے مابین ربط کا نام ہے مندرجہ بالا قضایا میں جسم اور علم موضوع ہیں اور تحیز اور ناظر و منظور وغیرہ محمول یا محکوم بہ (Predicate) ہیں، اب غور فرمائیے یعنی طول عرض اور عمق جسم کے تصور میں پہلے سے ذہنی طور (APRIORI) موجود ہیں محکوم بہ نے محکوم کو فقط واضح کیا اور کوئی ایسا حکم نہیں لگایا یا کوئی ایسا علم نہیں دیا جو محکوم کے تصور سے خارج ہو تحیز کا تصور جسم کے تصور کے مضمرات کے سوا کچھ نہیں ہے، جسم کے تصور میں یہی سب کچھ موجود ہوتا ہے گو کہ غیر واضح اور غیر معین ہوتا ہے اسی طرح جب ہم "علم" کا لفظ ادا کرتے ہیں تو ناظر اور منظور اس تصور کے لازمی شرائط ہوتے ہیں ہر چند کہ ہم علم کا لفظ ادا کرتے ہوئے ان مضمرات کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن علم کے تصور پر ذرا سا وقتِ نظر سے کام لیتے ہی ان دو شرائط پہ لازماً پہنچ جاتے ہیں اور اس غور و فکر میں جس کے نتیجے کے طور پر ناظر و منظور تک ہم رسائی پاتے ہیں "علم" کے تصور سے خارج ہوئے بغیر ان نتائج کو اخذ کرتے ہیں، تحلیلی علم (ANALYTIC SCIENCE) میں ابداً تقابل کا اصول عمل میں آتا ہے، یعنی موضوع اور محمول (SUBJECT PREDICATE) دو متقابل تصورات ہوتے ہیں بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے دو متقابل بیانات ہوتے ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں ہر دو مقولات / بیانات میں موضوع اس قدر واضح نہیں ہوتا جس قدر محمول یعنی بیان ثانی ہوتا ہے، چنانچہ تحلیلی علم LANGUASTIC ہوتا ہے۔

تالیفی علم (SYNTHETIC SCIENCE)

تحلیلی علم کے برعکس تالیفی علم اپنے موضوع کے تصور کے علاوہ محمول فراہم کرتا ہے اور ان دو الگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الگ حقائق و واقعات کی تالیف پر ہماری قوت علمیّہ حکم صادر کرتی ہے کہ یہ ایک ہیں اب محکوم بہ محکوم کی وضاحت نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اس کا غیر ہوتا ہے گویا علم اپنے موضوع کے علاوہ ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ موضوع اور محمول میں ربط ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں۔ تمام انسان فانی ہیں پتھر کو سورج نے گرم کر دیا مذکورہ بالا قضایا میں۔ انسان اور پتھر موضوع ہیں اور فانی اور " سورج نے گرم کیا " محمول ہیں۔ محکوم بہ ہیں۔ غور فرمائیے کہ فانی کا تصور انسان کے تصور کا بالکل غیر ہے ہم جب انسان کا لفظ ادا کرتے ہیں تو اس میں " فانی " کا تصور ہرگز شامل نہیں ہوتا اور اسی طرح پتھر کے تصور میں سورج کے گرم کر دینے کا تصور ممکن ہی نہیں ہیں، اسی باعث محکوم بہ محکوم بہ واقعتاً ایک اضافہ ہے تالیفی علم کا تعلق بیان سے نہیں ہے بلکہ اس علم کا تعلق کلی طور پر مشاہدے سے آپ ایک قضیہ بھی ایسا تشکیل نہیں دے سکتے جو حقیقت کے متعلق ہو اور مشاہدے کے علاوہ ہو اس کے باوجود مرکبہ (SYNTHETIC) ہو اس لیئے تالیفی علم (SYNTHETIC SCENCE) ہمیشہ (EXPERIMENTAL) مشاہداتی ہوگا۔

علم کی ان دو قسم انواع کو پیش نظر رکھنے کے بعد اب ہم اپنے موضوع یعنی تفسیر کی جانب متوجہ ہوتے ہیں سوال یہ ہے کہ علم تفسیر متذکرہ ہر دو انواع میں سے کونسا علم ہے؟ آیا یہ علم اپنے موضوع کو واضح کرنے والا علم ہے یا کہ موضوع کے بارے ہمارے علم میں اضافہ کرنا اس کا وظیفہ ہے؟ بالفاظ دیگر علم تفسیر کا مدعا موجود علم (GIVEN KNOWLEDGE) کو واضح کرنا ہے یا موجود علم میں اضافے کا خواہاں ہے؟ یعنی علم تفسیر تحلیلی علم ہے؟ یا کہ تالیفی علم ہے۔

ہم ماقبل مقدمات میں دیکھ چکے ہیں کہ تالیفی علم کا تعلق مشاہدے سے ہوتا ہے جبکہ تحلیلی علم کا تعلق بیان سے ہوتا ہے، چنانچہ اس امر میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ علم تفسیر تالیفی علم ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ کلی طور پر تحلیلی علم ہے یعنی اس علم کا مقصود موجود علم کو واضح کرنا ہے نہ کہ موجود علم میں کچھ اضافہ کرنا مطلوب ہوتا ہے جب یہ امر طے ہوگیا کہ تفسیر تحلیلی علم ہے اور تالیفی علم نہیں ہے تو ہم اپنے اصل مدعا کی جانب اس حوالے سے آگے بڑھیں گے کہ ہماری پوری جستجو کسی بھی مرحلے پر ان مطالبات میں نہ جا سکے جن کو صرف تالیفی علم میں پورا کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اب ہمارا کام فقط یہ ہوگا کہ اس علم کے ٹھیک ٹھیک معنی متعین کریں اور اس کے مضمرات یعنی وہی شرائط کو مکمل طور پر بیان کریں اور آخر میں اس علم کی حدود وصحت بیان کر کے اپنا کام ختم کریں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں ایک بات ضمناً بیان کر دی جاتی ہے، جیسا کہ علم کے پُرخلوص طالب کے لیے اہمیت حقیقت کے ان معنوں کی ہوتی ہے جن میں وہ حقیقت درست ہے اس لیے اس کی جستجو بھی یہی ہوتی اور حقیقت کا انکار کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے اور نہ منصب، اس لیے ہمارا مقصود علم تفسیر کی تنقید یعنی تفسیر کے ان معنوں کو متعین کرنا ہے جس میں وہ درست ہے نہ کہ تفسیر کا انکار مطلوب ہے۔

خلاصہ کلام :

ماقبل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ "علم ہمارے دیگر ادراکی قوی مثلاً خیال، رائے اور مفروضے سے بالکل متمیز اور منفرد ہے، یہ حقیقت کا بلا واسطہ فہم ہے گویا علم حقیقت کی نسبت ایک تصدیق ہے۔ ایک قضیہ ہے، اس قضیے کی صحت کا انحصار اس شرط پر ہے کہ اسکے متوازی خارج میں حقیقت بالکل ویسی ہی ہو جیسی کہ قضیہ میں بیان ہوئی ہے۔

علم اپنے وظیفے کے تعلق میں دو انواع پر مشتمل ہوتا ہے، ایک قسم وہ ہے جو اپنے موضوع (SUBJECT) کو واضح کرتا ہے اور موضوع کے بارے میں ہماری بصیرت میں اضافہ نہیں کرتا۔ اسے تحلیلی علم (ANALYTIC SCIENCE) کہا جاتا ہے، علم کی دوسری قسم وہ ہے جس میں موضوع کے بارے میں ہماری بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے یہ علم تالیفی علم (SYNTHETIC SCIENCE) کہلاتا ہے۔

علم تفسیر ایک علم ہے جو اپنے موضوع کو واضح کرتا ہے اور اپنے موضوع میں اضافہ نہیں کرتا۔ لہٰذا تفسیر تحلیلی علم ہے اور تالیفی علم نہیں ہے، تحلیلی علم کا موضوع ہمیشہ بیان ہوگا اور تالیفی علم کا موضوع حقیقت خارجیہ ہوگا۔ اول الذکر LANGUASTK ہے یعنی لسانیاتی ہے جبکہ موخر الذکر مشاہداتی (EXPEREMENTAL) ہے آئندہ صفحات پر علم تفسیر کو تحلیلی علم کے تناظر میں تنقید کا موضوع بنایا گیا ہے لہٰذا تحلیلی علم کے مفروضات اولیہ نیز تعینات کے علاوہ حدود وصحت کا کھوج لگایا جائے گا۔ قاری صاحبان سے گزارش ہے کہ تحلیلی علم اور تالیفی علم کے امتیاز کو ایک بار پھر دیکھ لیں تاکہ آئندہ مسائل کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

تفسیر کیا ہے ؟ اور تفسیر کیسے ممکن ہے ؟

تفسیر اصلاً کلام کی صفت ہے، ایسا کلام جو بالذات واضح ہو تفسیر کہلاتا ہے (دیکھئے القرآن ۲۵ آیت ۳۳) متن کے تعلق میں تفسیر مقصد کا بیان ثانی ہے، گاہے یہ مقصد صاحب تفسیر کا ہوتا ہے جس کے ابلاغ کے لیے وہ متن کو اساس بناتا ہے، اور گاہے یہ مقصد صاحب تصنیف کا ہوتا ہے جسے بیان اول یعنی متن سے زیادہ واضح، زیادہ آسان اور زیادہ قابل فہم یعنی زیادہ بہتر انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفسیر کی اول الذکر صورت جس میں صاحب تفسیر اپنے ذاتی مقاصد کے ابلاغ کے لیے متن کو بطور ذریعہ کے استعمال کرتا ہے ، فنون کے حوالے سے متن کو واضح کرنے کی جدوجہد کے نتیجے میں سامنے آتی ہے مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کو اس طرح واضح کیا جائے کہ اَلْحَمْدُ مبتدا ہے اور لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ خبر ہے وَقِسْ عَلٰی ھٰذَا فَعَلَلَ وَ تَفَعْلُلَ ۔ تفسیر کی یہ نوع متعلقہ فنون کے اصولوں سے مکمل ہم آہنگی پر استوار ہونے کے باوجود فقط اسی وقت لائق التفات ہو سکتی ہے جب اس مفروضے کو بطور مسلّمہ قبول کر لیا جائے کہ صاحب تفسیر کا مقصد صاحب تصنیف کے مقصد کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے ۔ اس مسلّمہ کو قبول کیے بغیر تفسیر کی یہ نوع ہرگز درخور اعتنا نہیں ہو سکتی ، اسی طرح وہ دقیق نظری نکات جن کا لحاظ رکھے بغیر صاحب تصنیف نے اپنا مقصد بیان کیا ہے ، صاحب تفسیر کی فطانت وذکاوت کا نتیجہ ہوتے ہیں ، ان اختراعات و موشگافیوں سے صاحب تصنیف کا شعور بالکل معصوم اور پاک ہوتا ہے ، صاحب تصنیف جس مقصد کا ابلاغ چاہتا ہے اسے اپنے سخن کا موضوع بناتا ہے ۔ اگر صاحب تصنیف اپنے مقصد کے ابلاغ میں کامیاب ہے یعنی اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر قادر ہے تو وہ صرف ایک مقصد کا ابلاغ کر سکتا ہے ۔ کثیر الجہات کلام نہ صرف لغو و بے معنی ہوتی ہے بلکہ صاحب کلام کے باشعور شخصیت ہونے یا مخاطب کو کچھ سمجھانے میں مخلص ہونے کے اعتماد کو ضائع کیے بغیر نہیں رہ سکتی ، اور اگر کلام اپنے مقصد کے ابلاغ میں کامیاب ہو تو مخاطب کے اس طرز عمل سے کہ وہ کلام کے اصل مقصد یعنی صاحب کلام کے مقصد کے علاوہ دیگر مقاصد کی جانب متوجہ ہو تو اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ صاحب کلام کو لائق اعتبار سمجھنے میں متردد ہے یعنی صاحب کلام سے اس کی وفاداری مشکوک ہے ، لہٰذا ایسی تفسیر جس میں فنون کا نقطہ نظر غالب ہو یا دقیق نظری نکات پر مشتمل ہو صاحب تصنیف کے مقصد کے فہم میں ہرگز معاون نہیں ہو سکتی نہیں بلکہ تفسیر کی یہ نوع صاحب تصنیف کے مقصد کے فہم میں ایک قدغن ہے ایک رکاوٹ ہے ۔

تفسیر کی وہ نوع جس میں صاحب تصنیف کے مقصد کو بیان اول یعنی متن سے زیادہ واضح ، زیادہ آسان اور زیادہ قابل فہم یعنی زیادہ بہتر میں بیان کیا جاتا ہے ، تفسیر کی تنقید میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے ، اس کی وجہ یہ ہے کہ تفسیر کی یہ نوع درحقیقت صاحب تصنیف کے ابلاغ کی استعداد کو ایک چیلنج ہے ، اس لیے تفسیر کی یہ نوع ہماری توجہ کی بلکہ بھرپور توجہ کی مستحق ہے ۔ تفسیر کی اس کا ٹھیک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ٹھیک مفہوم و معنی متعین کرنا اور اس کی ان شرائط کو دریافت کرنا جن کے بغیر تفسیر نہ ہو سکے، انتہائی ضروری ہے۔ تفسیر کی اس تنقید میں ہم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تا وقتیکہ تفسیر کی ان شرائط اور حدود وصحت کو دریافت نہ کرلیں۔ علاوہ ازاین تفسیر کے صحیح ترین مفہوم تک رسائی کے بعد ہی ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ ہر ایک تفسیر تفسیر ہونے کے تحکم و ادعا کا جائزہ لیں۔

تفسیر کی یہ نوع مقصد کا ایسا بیان ثانی ہے جس کی نسبت خیال ہوتا ہے کہ وہ اس غیر ضروری اجمال یا غیر ضروری تفصیل سے پاک ہے جس نے بیان اوّل میں مقصد کے ابلاغ میں قدغن پیدا کر دی ہے گویا بیان اوّل میں ایک قسم کی تعقید پائی جاتی ہے جس کو رفع کرنے کے لیے بیان ثانی بطور تفسیر جاری کیا جاتا ہے۔ اگر بیان اوّل اپنے مقصد کے ابلاغ میں کامیاب ہو واضح ہو اور کسی ایسے نقص کا حامل نہ ہو جس سے مقصد کا کامل ابلاغ ممکن نہ رہا ہو تو تفسیر قطعی طور غیر ضروری ہو گی۔

تفسیر کا مفروضہ اولیّہ (PRESUPPOSITION) یہ ہے۔ کہ بیان اوّل میں جس مقصد کو ادا کیا گیا ہے اُسے زیادہ قابل فہم، زیادہ واضح اور زیادہ آسان بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر بیان اوّل کے مقصد کو بیان اوّل سے بہتر ادا کرنا ممکن ہے۔ گویا تفسیر کرنے سے قبل یہ فرض کرنا ضروری ہے کہ بیان اوّل مقصد کے ابلاغ میں ویسا کامیاب نہیں ہے جیسا کہ درکار ہے، اس نقص کی تلافی بیان ثانی میں کی جاتی ہے۔

تفسیر میں تقابل کا اصول کام کرتا ہے، یہ دو متقابل بیانات ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔ بیان اوّل کو متن اور بیان ثانی کو تفسیر کہتے ہیں۔ بیانِ ثانی کی صحت کا انحصار اس شرط پر ہے کہ وہ بیان اول کے مقصد کا ایسا کامل احصار و ابلاغ کرے کہ اس کی نفی بیان اوّل کی نفی متصوّر ہو، نیز بیان ثانی کی موجودگی بیان اوّل کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہو، اگر تفسیر اس شرط کو پورا نہ کر سکے تو وہ متن کے مقصد کے زیادہ سہل ابلاغ دعوے میں صداقت کی متحمل نہیں ہو سکتی، حقیقت یہ ہے کہ اس اعتماد سے محروم ہو کر متن کی تفسیر فقط اسی وقت لکھی جا سکتی ہے جب قاری کو متن سے محروم رکھنے کی آرزو غالب ہو۔

تفسیر کے معنی کے صحیح ترین تعین کے بعد اب ہم دوسرے سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی تفسیر کیسے ممکن ہے ؟۔ وہ کیا شرائط ہیں جن پر تفسیر کی صحت کا انحصار ہے اور جن کا لحاظ رکھے بغیر تفسیر کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔ یہ پانچ شرائط ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱ - بیان اوّل جس کی تفسیر کی جائے، میں واقعتاً ایسی تعقید پائی جائے جس سے بیان اول میں مقصد مبہم اور غیر واضح ہو گیا ہو۔ اگر بیان واضح اور صاف ہو تو تفسیر بالکل غیر ضروری ہو جائے گی۔

۲ - تفسیری بیان کے لیے ضروری ہے کہ وہ غیر ضروری اجمال اور غیر ضروری تفصیل سے پاک ہو تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو۔

۳ - تفسیری بیان مقصد کے ابلاغ و احصار میں اس حد تک کامیاب ہو کہ اس کا انکار بیان اوّل کا انکار متصور ہو۔

۴ - تفسیری بیان کی موجودگی بیان اوّل کے عدم و وجود کو یکساں کر دے یعنی متن سے پوری طرح مستغنی کر دے۔

۵ - اس تعقید کی نشاندہی کی جائے جس نے متن میں مقصد کے ابلاغ میں قدغن پیدا کر دی ہے۔

مندرجہ بالا شرائط بالذات واضح ہیں اور تفسیر کے تصوّر میں وہبی ([illegible]) مضمرات ہیں یہ فقط ان کا انتزاع ہے جو کوئی بھی تفسیر کی متمیز صورت پر غور کرے گا ان کی موجودگی دریافت کیے بغیر نہیں رہ سکے گا، اس لیے ان شرائط میں کسی ایک کو نظر انداز کر دیا جائے تو تفسیر کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں ان شرائط کو ملحوظ رکھے بغیر نہ تو تفسیر کو بطور علم مدلل کے پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی علم تفسیر میں اشتراک فی العلم کا کوئی امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

تفسیر کی اس کلی صورت گری (UNIVERSAL FORMULATION) اور وہبی مضمرات بیان کر چکنے کے بعد اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ

کیا قرآن مجید کی تفسیر ممکن ہے؟

قبل ازیں کہ ہم قرآن پاک کی نظری تفسیر کی مشکلات اور امکانات کو زیر بحث لائیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "عملی تفسیر" کا تجزیہ کر لیا جائے اور دیکھیں کہ عملی تفسیر کی اصطلاح اپنے مطلب و مفہوم کی ادائیگی میں کس حد تک کامیاب ہے۔ علم کی تقسیم میں ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ وہ علم جو اپنے موضوع کی تفسیر کرتا ہے یعنی اپنے موضوع کو واضح کرتا ہے ہمیشہ نظری ہوگا۔ عقلی ہوگا اور کبھی مشاہدے پر مبنی نہیں ہوگا۔ چونکہ تفسیر ہمیشہ واضح کرنے تک محدود ہوگی اور کوئی ایسا تصوّر جو موضوع میں پہلے سے موجود نہ ہو بلکہ موضوع سے خارج ہو اور موضوع پر اضافہ ہو کبھی تفسیر کے زمرے میں نہیں آئے گا بلکہ وہ تالیف ہوگا یعنی موجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علم میں اضافہ ہوگا اندریں صورت اس قسم کے تصوّر کو وضاحت یا تفسیر نہیں کہا جا سکتا ہے، عملی تفسیر کی مثال الصلوٰۃ کے لیے صلوٰۃ کی تعمیل کی دی جاتی ہے، اب غور فرمائیے کہ صلوٰۃ (دعا) کا تصوّر کیا قیام، رکوع، سجود اور قعدہ کی مخصوص ہئیت کو اپنے اندر رکھتا ہے؟ آپ صلوٰۃ (دعا) کے تصوّر کو جس قدر چاہیے تجزیہ و تحلیل کا موضوع بنائیے اور جب تک آپ اس تصوّر پہ غور کر سکتے ہیں کیجیے آپ قیام، رکوع، سجدہ اور قعدہ تک کبھی نہیں پہنچیں گے، برعکس اس کے صلوٰۃ (دعا) کے ذہنی مضمرات فقط یہ تین ہیں یعنی دعا مانگنے والا، جس سے دعا کی جارہی اور تیسری چیز وہ مقصد ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے دعا کی جارہی ہے۔ آپ دعا یا صلوٰۃ کی تحلیل میں جو کچھ پا سکتے ہیں وہ فقط یہ تین ہیں قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ کے لیے آپ کو دعا کے تصوّر سے کلی طور پر خارج ہونا پڑتا ہے، اس لیے کہ قیام، رکوع اور سجدہ وغیرہ لفظ صلوٰۃ کی تفسیر نہیں ہیں بلکہ حکمِ صلوٰۃ کی تعمیل ہیں اور یہ تصورات یعنی قیام، رکوع وغیرہ لفظ صلوٰۃ پر ایک اضافہ ہیں۔

آئیے اس پر مزید غور کرتے ہیں اور ایک اور طرح سے مسئلے کو حل کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ "حکم" کے ذہنی مضمرات تین ہیں۔ یعنی صاحبِ حکم، مخاطب حکم اور طلبِ حکم، صاحب حکم کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ طلب حکم کو متعین کرے مخاطب حکم سے اس کی تکمیل کا تقاضا کرے۔ اور مخاطب حکم کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ صاحب حکم کی طلب کی تکمیل کی نیت سے حکم اتباع کرے اور طلب حکم کے لیے ضروری ہے کہ صاحبِ حکم اور مخاطب حکم ہر دو اس سے یکساں باخبر ہوں، حکم کے تصوّر میں مخاطب حکم کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا ہے کہ وہ طلب حکم کا متعین کرے۔ اب حکم صلوٰۃ میں صلوٰۃ کی تعمیل کو متعین کرنا مخاطب حکم کا کام نہیں ہے بلکہ یہ صاحب حکم کا کام ہے کہ حکم صلوٰۃ کی تعمیل کی صورت متعین کرے۔ اور مخاطب حکم کو اس باخبر کرے۔ چنانچہ حکم صلوٰۃ کی تعمیل سے بھی خود صاحب حکم نے باخبر فرمایا۔ اس لیے قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ کو وحی غیر متلو کہا جاتا ہے، یعنی اَقِیموا الصَّلوٰۃ وحی متلو ہے تو اس کی تعمیل یعنی صلوٰۃ کی ہئیت کذائیہ وحی غیر متلو ہے اور یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی تعین نہیں ہے، دورِ جدید میں کچھ مغرب گزیدہ نام نہاد منکرین نے انکارِ حدیث کے شوق میں وحی غیر متلو کے تصوّر کو ہی اڑا دیا اور صلوٰۃ کے مفہوم کو متعین کرنے کا حق اپنے ہاتھ میں لینے کی سعی کی ہے اگر وہ اس پہ ذرا سا غور فرما لیتے کہ مخاطب حکم کا وظیفہ کیا ہے تو اس کام کی جسارت نہ کرتے مگر اجتہادنو" کا زعم "حق" کو کہاں پنپنے دیتا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے" اَقِم الصلوٰۃ " کہ آپ صلوٰۃ قائم کریں۔ اور ادھر جبریل علیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

السلام آتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صلوٰۃ کا عمل دہراتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس تعلیم ربانی سے صلوٰۃ کے حکم کی طلب سے باخبر ہوتے ہیں اور پھر امت کو حکم ہوتا ہے کہ "صلوا کما رایتمونی اصلی" جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح تم پڑھو، اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم صلوٰۃ کی تعمیل قیام رکوع، سجدہ، اور قعدہ کی صورت میں فرمائی ہے، اور ہم یہ پہلے عرض کر چکے ہیں کہ تفسیر بیان کی ہوتی ہے یعنی تفسیر مقصد کا بیان ثانی ہے۔ آپ اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ صلوٰۃ کا مقصد ہیں تو اسے چاہیے کہ وہ اس پر مزید غور کرے۔ صلوٰۃ کا مقصد قیام، رکوع، سجدہ اور قعدہ ہرگز نہیں ہیں، بلکہ صلوٰۃ کی یہ تعمیل ہیں، قیام، رکوع، سجدہ کو صلوٰۃ کی عملی تفسیر کہنا زبان کا غلط استعمال ہے نیز ایک ذہنی التباس کا نتیجہ ہے جو تفسیر اور تعمیل کے امتیازات اور مضمرات کو نہ سمجھنے کے باعث پیدا ہو گیا ہے۔ دیگر عبادات کو اسی پر قیاس فرمائیے، آپ دیکھیں گے ہر ایک حکم ہے اور حکم کی تعمیل وحی غیر متلو کے علاوہ کہیں سے میسر نہیں آسکتی۔

عملی تفسیر کی اصطلاح کی مشکلات اور اس لفظ کے بے معنی ہونے کو واضح کر لینے کے بعد ہم نظری تفسیر کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

دورِ جدید کے مفکرین نے کلام مجید کی تفسیر جدید علوم کے حوالے سے کی ہے اور کچھ نے قدیم انداز برقرار رکھا ہے اور جدید علوم سے فیض یاب بھی ہوئے ہیں، علم تفسیر پر جو کام ہوا ہے وہ اپنی جگہ پر لیکن خود تفسیر فی نفسہٖ کن تقاضاجات سے متشکل ہوتی ہے اس پر کسی نے غور نہیں کیا مثلاً دورِ حاضر کے مغرب گزیدہ مفکرین نے تفسیر قرآن کے لیے تصریفِ آیات کو بطور منہاج (METHOD) اختیار کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک مفہوم کو ادا کرنے والی تمام آیات کو یکجا کر کے پڑھا جائے، گویا ان حضرات کا خیال ہے کہ اگر قرآن کریم کو سمجھنا ہے تو چودہ سو سالہ پرانا ایڈیشن اب ناکارہ ہو گیا ہے اور ایک جدید ایڈیشن کی ضرورت ہے جس میں یہ خیال رکھا جائے، غور فرمائیے کہ کس قدر لغو بات ہے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض کرم فرماؤں نے جدید ایڈیشن شائع کر دیئے ہیں۔ تصریفِ آیات کے منہاج پر کی جانے والی تفسیر کی دیگر مشکلات کے علاوہ یہ مشکل کہ اس سے قرآن کریم کے لیے ایک جدید ایڈیشن کی احتیاج کا تقاضا پیدا ہوتا ہے، سب سے نمایاں ہے۔

قرآن مجید کی تفسیر کرنے سے قبل یہ فرض کرنا ضروری ہے کہ مقاصد قرآن کو قرآن مجید سے زیادہ واضح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ آسان، زیادہ قابل فہم بنایا جاسکتا ہے، یعنی قرآن پاک اپنے مقصد کے ابلاغ میں ویسا کامیاب نہیں ہے جیسا کہ ہونا درکار ہے۔ کیا یہ فرض کرنا مناسب ہے؟

کیا کوئی تفسیر اس دعوے کے ساتھ پورے تفسیری لٹریچر میں سے پیش کی جاسکتی ہے جو قرآن کے مقاصد کو اس طرح سے CONTAIN کرتی ہو کہ اس کا انکار قرآن پاک کا انکار متصوّر ہو؟

کیا کوئی تفسیر ایسی ہے جس کے بارے میں یہ فرض کیا جاسکے کہ اس کی موجودگی نے قرآن کریم موجودگی کو غیر ضروری کر دیا ہے؟ اگر قرآن مجید کے بیان میں ایسی کوئی تعقید پائی جاتی ہے جس سے مقصد کا فہم ممکن نہیں رہا ہے تو مفسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی نشاندہی کرے۔

اگر قرآن کریم تفسیر کی احتیاج میں ہے تو قرآنی فصاحت وبلاغت کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ کہ ادب برائے ادب کا بہترین شہکار ہے؟ یا قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے ابلاغ میں حسن وخوبی کے ساتھ کامیاب ہے اس کی مثال پیش کرنا ناممکن ہے اور اگر موخر الذکر صورت درست ہے تو تفسیر کی گنجائش ہے؟

اگر تفسیر مقاصد قرآنی کا زیادہ واضح اور زیادہ قابلِ فہم بیان ہے تو قرآن مجید کے اس دعوے کا کیا ہوگا کہ "قرآن مجید کی مثل کلام پیش نہیں کیا جاسکتا"۔ تفسیر بالکل متوازی اور متقابل بیان ہے جو متن کے مقصد کو متن سے زیادہ واضح، زیادہ آسان، زیادہ قابلِ فہم یعنی زیادہ بہتر بیان ہے چنانچہ تفسیر متن کے مساوی یا مثل ہی نہیں ہوتی بلکہ متن سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ تفسیر واقعتاً اس دعوے کے غلط ہونے کا بین ثبوت ہے، ہم نہیں جانتے کہ کلام یا بیان کی خوبی مقصد کے آسان ترین اور واضح ترین ہونے کے سوا بھی کچھ ہوسکتی ہے اگر تفسیر اس خوبی کی حامل ہے اور جیسا کہ خود لفظ تفسیر اسی مفہوم کی ادا کر رہا ہے تو متن کے فصیح وبلیغ کلام ہونے کا دعویٰ ایک شاعرانہ تعلی ہے۔

علم تفسیر کی ان مشکلات کا تقاضا ہے کہ ہم قرآن کریم کے تعلق میں تفسیر کے امکان کا از سر نو جائزہ ہی نہ لیں بلکہ اس سے فوراً دست کش ہوجائیں۔

آئیے ایک اور سوال پر غور کرتے ہیں کہ "تفسیر کا سوال قرآن کریم کے تعلق میں کیونکر پیدا ہوتا۔ یعنی تفسیر کا سوال کیسے اٹھتا ہے؟ وہ کیا محرکات ہیں جن کے باعث ایک قاری تفسیر کرنے یا لکھنے کی جانب کیونکر متوجہ ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب قاری کا مسئلہ اور قرآن کا مسئلہ ایک نہ ہو تو قاری کو قرآن کریم کی تفسیر کی احتیاج محسوس ہوتی ہے، قرآن پاک کے نازل ہونے کی غایت یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السّلام اس کی اتباع سے اپنے مقصود بعثت کو حاصل فرمائیں۔ یعنی قرآن کریم ہدایت ہے پیغمبر علیہ السّلام کے لیے۔ ایصال الی المطلوب ہے۔ یعنی وہ لائحہ عمل ہے وہ طریقہ کار ہے جس کی بدولت پیغمبر علیہ السلام اور آپ کے متابعین بعثت نبوی علی صاحبہا التحیۃ والسّلام کے مقصد کو حاصل کرکے رہیں۔ گویا قرآن پاک کا مسئلہ یہ ہے کہ جو کچھ ہونا چاہیے وہ کیسے ہو کر رہے؟ یعنی پیغمبرانہ مقاصد کو کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟۔ ایصال الی المطلوب کیسے متحقق ہو سکتا ہے؟۔ قرآن مجید اس مسئلے کا حل ہے بایں طور قاری کی طلب یہ ہونی چاہیے کہ وہ پیغمبرانہ مقاصد کے حصول کی شرائط دریافت کر رہا ہے، قاری اپنی اس طلب کے جواب میں قرآن سے نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے مقصد کو پانے کی حتمی، قطعی اور یقینی ضمانت پائے گا، لیکن جب قاری کا مقصود ہدایت نہ ہو۔ یعنی پیغمبر علیہ السلام کے مقصود کو حاصل کرنے کے لیے ہدایت کے شرائط دریافت نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ قرآن کریم کے حوالے سے ایسے مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے جن کا نزول قرآن کی غایت سے دور کا واسطہ نہیں ہوتا مثلاً قاری جن مسائل کا حل چاہتا ہے وہ علم صرف ہے یا نحو یا دیگر فنون مثلاً ادب بلاغت، فقہ، فلسفہ، کلام (قدماء کے پیش نظر یہی مسائل تھے) یا پھر جدید علوم اور سائنسی انکشافات وغیرہ ہیں وہ ان مسائل کا حل چاہتا ہے جو نزول قرآن کی غایت سے بالکل غیر متعلق ہیں، قاری قرآن پاک کو اپنے علم سے ہم آہنگ دیکھنے کا خواہاں ہے وہ اسی آرزو کے ساتھ قرآن پاک کی جانب متوجہ ہوتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کریم اس کے علم سے بالکل ہم آہنگ ہے لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی احساس ہوتا ہے، کہ اگر قرآن میں بیان شدہ بات تک مسئلہ کو چھوڑ دیا جائے تو مطلب پوری طرح واضح نہیں رہے گا گویا قاری کے لیے یہ بات بڑی مشکل ہو جاتی ہے کہ متن قرآن کو اس مقصد کے لیے کافی سمجھے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قاری کے مطلب کے ابلاغ میں تو قرآن ناقص ہے، اب قاری سوچتا ہے کہ اسی بیان شدہ مقصد کو اس طرح سے یا اس طرح سے بیان کر دیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جائیگی بس اسی وجہ سے وہ قرآن پاک کے مقابل ایک بیان جاری کرتا ہے اور یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ قرآن پاک ہی کے مقصد کو زیادہ واضح اور زیادہ قابلِ فہم بنا دیا گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تفسیر کے نام سے جاری ہونے والا بیان جن مقاصد کا ابلاغ کر رہا ہوتا ہے وہ اس مقصد سے کوئی تعلق نہیں متن کے تعلق میں تفسیر بالکل جدید مقاصد کی حامل ہوتی ہے یعنی وہ موجود علم کی وضاحت ہونے کے بجائے موجودہ علم میں اضافہ کر رہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتی ہے متاصد قرآنی کے لیے قرآن سے زیادہ واضح اور زیادہ آسان کلام ممکن ہی نہیں ہے، قرآن پاک اپنے مقصد کے ابلاغ میں سہل ممتنع کلام ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صاحب تصنیف کے مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد کے تناظر میں متن کو سمجھنا یا سمجھانا متن کو Misuse کرنا ہے چنانچہ قرآن پاک کو پیغمبرانہ مقاصد کے حصول کے لیے ہدایت کے محتوای کے علاوہ کسی بھی تناظر میں دیکھنا قرآن کریم کو Misuse کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے نزول قرآن کی غایت نہ فلسفہ ہے نہ کلام نہ فقہ ہے بلکہ نزول قرآن کی غایت حق کا غلبہ درکار ہے، فرد پہ، معاشرے پر اور عالمی سطح پہ۔ گویا انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی باطل کے اثر سے نکل جائے، فرد خواہشات کا غلام نہ رہے، معاشرہ، حرص و ہوس، طبقاتی اونچ نیچ میں نہ رہے، اور حاکم و محکوم کے لیے دو قانون نہ رہیں بلکہ معاشرت اخوت کے اصول پر اور معیشت، انفاق، ایثار اور احسان کے فضائل پر اور سیاست کلمہ طیبہ پر مبنی معاہدہ عمرانی پر قائم ہو جائے یہ وہ مقاصد ہیں جن کو کیسے حاصل کیا جائے ؟ کے سوال کے جواب کے طور پر قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ اب اگر قرآن کریم کو ان مقاصد کے حصول کی ہدایت کے مضمرات کے حوالے سے پڑھا جائے تو وہ اپنے مقصد کے ابلاغ میں سب سے زیادہ کامیاب کلام ہے لیکن مفسر کی مجبوری یہ ہے کہ وہ قرآن پاک سے مقصود بعثت کو حاصل کرنے کی شرائط جاننے کے بجائے اپنے اس علم سے متوجہ ہوتا ہے جس سے وہ متعلق ہے (موازنے کے لیے مختلف نمونہائے تفاسیر کو سامنے رکھیئے اور جائزہ لیجئے۔

اگر دورِ حاضر کا کوئی مسلم اسکالر اپنے علمی کیریر کے لیے تفسیر کو اپنا مضمون (SUBIECT) بنانے کا خواہاں ہے اور وہ اس کام کو قرآن کی خدمت سمجھ کر اختیار کرنا چاہتا ہے تو میری ان سے گزارش ہے کہ قبل اس کے کہ وہ ضروری ہے کہ وہ پہلے اس امر کا جائزہ لے لیں کہ تفسیر فی نفسہٖ ہے کیا ؟ اور اس سوال کا جواب سوا اس کے کہ یہ مقصد کا ایسا بیان ثانی ہے جو بیان ثانی ہے جو بیان اول سے زیادہ واضح ہے زیادہ قابل فہم اور زیادہ آسان ہے، نہ پائیں اور یقیناً اس سوال کا سوا اس کے کوئی دوسرا جواب نہیں ہو سکتا تو پھر انہیں چاہیے کہ قرآن کریم کے تعلق میں یہ سوال اٹھائیں کہ۔ کیا قرآن کریم کی تفسیر ممکن ہے ؟۔ یعنی کیا قرآن کے مقاصد کو ہم قرآن کریم سے زیادہ واضح بیان میں ادا کر سکتے ہیں ؟ وہ اپنے اس سوال کے جواب سے جو اطمینان حاصل کریں تو پھر انہیں اس کام کو کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا چاہیے، اگر وہ اپنے آپ کو ربّ ذوالجلال سے زیادہ قادر کلام محسوس کریں تو وہ آزاد ہیں اور ہماری ان سے کوئی بحث نہیں ہے بصورت دیگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ اس سے درست بردار ہو جائیں۔ بالخصوص وہ حضرات جو اس وقت کلام مجید کی تفسیر لکھنے میں مصروف ہیں انہیں چاہیے کہ وہ تفسیر کا صحیح ترین مفہوم، اس کی شرائط اور حدود وصحت کو پہلے متعین کر لیں۔ اس جستجو کے نتائج انہیں اس کی اجازت دیں تو وہ اپنے کام کو جاری رکھیں ورنہ اس سے فوراً دست کش ہو جائیں۔ اگر تفسیر قرآن متن قرآن سے زیادہ آسان، زیادہ قابل فہم بیان ہی ہے تو پھیر یہ کہ تفسیر، قرآن پاک کی اصلاح کے سوا کچھ نہیں ہے ہمیں قرآن پاک کی اصلاح کرنے کی بجائے اپنی اصلاح کرنی زیادہ ضروری ہے۔

یہ حس عامہ کی صداقت ہے۔ کہ کسی بھی علم مدلل (ناقابل انکار علم) کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اشتراک فی العلم ہوتا ہے نتائج میں وحدت ہوتی ہے ہر ایک اسکالر ایک ہی مفہوم تک رسائی پاتا ہے اگر نتائج میں اختلاف ہو تو علم مدلل میسّر نہ آنے کی دلیل ہے اور یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ اختلاف فی العلم کی صرف دو وجوہات ہوتی ہیں۔

۱۔ یہ کہ حقیقت کا مشاہدہ جزوی ہے۔

۲۔ یہ کہ بد دیانتی سے کام لیا جا رہا ہے۔

علم کا پُرخلوص طالب اختلاف فی العلم کو اسی نظر سے دیکھتا ہے۔ کہ حقیقت کا کلی مشاہدہ عمل میں نہیں آیا ہے۔ اور جب کلی مشاہدہ ہو جائے تو تشکیک کو اس قدر وسیع کر دینا کہ علم یقینی ممکن ہی نہ رہے ایک غیر سنجیدہ اور ناپسندیدہ طرز عمل ہے۔ اس لحاظ کلی مشاہدہ اختلاف فی العلم کو ختم کر دیتا ہے اور اب تک کا تفسیری لٹریچر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ علم تفسیر نہ تو علم مدلل بنا ہے اور نہ ہی اس میں اشتراک فی العلم کا کوئی امکان ہے اب اگر کم وبیش تیرہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی یہ علم اشتراک کے نصب العین کو حاصل کر سکنے میں ناکام رہا ہے تو ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اس بات کا جائزہ لیں کہ آخر تفسیر بطور علم کے کیا معنی رکھتا ہے؟ اور جب اس کا ٹھیک ٹھیک تعیّن ہو جائے تو پھر بجا طور پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ تفسیر کیسے ممکن ہے؟ یعنی وہ کیا شرائط ہیں جن کے تحقق کے بغیر تفسیر کے تفسیر ہونے کا دعویٰ لغو اور بے معنی ہوگا؟ مَیں نے اپنی طالب علمانہ جستجو میں کچھ شرائط دریافت کی ہیں، میرے دیگر طالب علم دوستوں کے لیے راستہ کھلا ہے وہ دریافت کریں ممکن ہے کہ وہ اس پر کچھ اضافہ کر لیں، تاہم اپنی جستجو میں تفسیر کے اس معنی اور ان شرائط کی صحت کے پیچھے انسان کا یقین کارفرما رکھتا ہوں، اس لیے علم تفسیر پر تحقیق کرنے والے اسکالرز انشاءاللہ ان حدود کی نفی نہ کر سکیں گے اضافے کے لیے میدان وسیع ہے، بہرحال ان شرائط کو بیان کر لینے کے بعد ہم اس قابل ہو سکتے ہیں کہ تفسیر کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختلاف کا سبب جان سکیں حقیقت یہ ہے کہ تفسیر میں اختلاف کی وجہ سوائے اس کے کہ ہر مفسر کا محرک مختلف ہوتا ہے ہر ایک کے نزدیک قرآن پاک کی اصلاح فقط اسی نقطۂ نظر سے ہو سکتی ہے جس کا مفسر عالم ہے یا جس کے ساتھ مفسر وفادار ہے۔

منہاج القرآن کی ضرورت :

منہاج جدید اصطلاح ہے۔ اس کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس لفظ کے استعمال کو جان لیا جائے درحقیقت یہ لفظ جدید مغربی فلسفہ میں استعمال ہوا ہے، قدماء کے اختلاف کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ نتائج فکر پر اصرار کرنے اور دلیل و استدلال کے ذریعہ سے دوسروں کو قائل کرنے کے طرز عمل کو ترک کر کے منہاج کا اصول اختیار کیا جائے۔ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ۔ ایک بنیادی اصول کو بطور مسلمہ قبول کر لیا جاتا ہے اور پھر اسی اصول کی روشنی میں علمی مسائل حل کیے جاتے ہیں۔ اور ہر ایک اسکالر اپنی جستجو سے نتائج مرتب کرتا ہے، اگر نتائج میں وحدت ہوتی ہے تو یہ منہاج کی صحت کی علامت ہے اور اگر اختلاف ہو تو کسی دوسرے منہاج کو وضع کرنے کی جدوجہد ہوتی ہے حتیٰ کہ منہاج جو بالکل صحیح ہوتا تک رسائی ہو جاتی ہے۔ نتائج فکر کی صحت پر مغز ماری کرنے سے زیادہ موزوں طریقہ منہاج کا ہے ہر چند کہ اس کا جدید استعمال علماء مغرب نے کیا ہے تاہم اس قسم کے مطالعہ کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جب تک مطالعہ قرآن کے لیے کسی منہاج کو وضع نہ کر لیا جائے تو اشتراک فی علم القرآن ناممکن رہے گا، اب وہ منہاج جس کے حوالے سے قرآن کریم کا مطالعہ کرنا ہے اس کا بنیادی اصول کیا ہے؟ اور وہ کیا مسائل ہیں جو امت کے لیے اہمیت رکھتے ہیں؟ انہیں دریافت کرنا ضروری ہے۔ منہاج القرآن کا بنیادی اصول یہ ہے کہ قرآن کریم پیغمبر علیہ السلام پر پیغمبرانہ مقاصد اور ان کے حصول کے لائحہ عمل کے لیے نازل ہوا ہے۔ گویا پیغمبر علیہ السلام کی آرزو و ہدایت مقدم ہے اور نزول قرآن مؤخر ہے۔ اس اصول کی روشنی میں قرآن پاک کو صحیفہ انقلاب متصور کرنا ہوگا۔ (اس اصول اور مسائل پر بالاستیعاب مباحث قبلہ استاذیم ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب کی کتاب منہاج القرآن میں درج ہیں اس کا مطالعہ فرمائیے)۔

ہر ایک اسکالر اس منہاج کے اصول کی روشنی مطالعہ قرآن کی جانب متوجہ ہو تو پھر اسے صرف ایصال کے مضمرات اور حد و وصحت کی قرآن پاک سے جستجو ہوگی۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھے بغیر کلام مجید کی حیثیت ایک ایسے کلام کی ہوگی جو بالکل بے مقصد ہے اور اس کا مقصد تفسیر سے میسّر کیا جائے گا۔ اب اگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کلام الٰہی کا مقصد تفسیر سے میسّر آئے تو قرآن پاک کی کیا حیثیت رہ جائے گی؟ مختلف نمونہائے تفاسیر کے مطالعے سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ کلام مجید کو اپنے مزعومہ مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے اور قرآن پاک سے پیغمبرانہ مقاصد کے حصول کے لائحہ عمل کو پانے کے بجائے اسے فرقہ وارانہ آرزوں کی تکمیل کا آلہ بنایا جا رہا ہے، اگر ہم اس اجتماعی خودکشی سے نکل سکیں اور قرآن پاک کی اصلاح کی بجائے اپنی اصلاح چاہیں تو اس اعتماد کو بحال کیا جا سکتا ہے جو ہمیں موجودہ زوال پر غالب کر کے رہیگا اور اس کے لیے تفسیر کتاب کے بجائے تعلیم کتاب کا اہتمام کیا جائے گا۔

تعلیم اور تفسیر میں امتیاز:

تعلیم اور تفسیر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تعلیم میں متن کا ابلاغ ہوتا ہے جبکہ تفسیر میں متن کے مقصد کا ابلاغ ہوتا ہے، تعلیم ہرگز بیانِ ثانی نہیں ہے جبکہ تفسیر لازماً "بیانِ ثانی" ہے اور متقابل بیان ہے بیانِ اوّل اور بیانِ ثانی کی تفریق کا انحصار اس مزید صراحت و وضاحت پر ہے جو بیانِ اوّل میں نہیں ہوتی اور بیانِ ثانی میں پائی جاتی ہے، تفسیر اور ترجمانی میں بھی ایک فرق اسی مقام پر واقع ہوتا ہے ترجمانی (INTERPETAION) دوسرے کے مقصد کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے کا نام ہے، اور اس میں صراحت و وضاحت کا کوئی کام نہیں ہوتا، جبکہ تفسیر ترجمانی سے وسیع تر چیز ہے اس وضاحت کا sense موجود رہتا ہے۔

اگر آپ تعلیم کے تصوّر کی دقتِ نظر سے تحلیل کریں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ تعلیم کے تصوّر میں تین لازمی شرائط ہیں جن میں سے ایک بھی غائب ہو جائے تو تعلیم کا متحقق ہونا ممکن ہی نہیں رہتا۔ یہ تین شرائط معلّم، متعلّم اور نصاب ہیں معلّم کے لیے ضروری ہے کہ وہ نصاب سے پوری طرح باخبر ہو، اور متعلّم کے لیے ضروری ہے کہ وہ نصاب سے پوری طرح بے خبر ہو، نصاب کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلّم اور متعلّم کے مشترک مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہو، اس نصاب میں فقط یہی ایک کشش ہوگی جو متعلّم اور معلّم کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ تعلیم کا بنیادی اصول جس پر تعلیم کی پوری عمارت اٹھتی ہے۔ تدریج کا اصول ہے۔ یعنی یہ تدریج متعلّم کے ذہن کو اس مشترک نصب العین کے حصول کے قریب تر کیا جائے گا جیسے یکم جماعت سے دوم پھر سوم حتیٰ کہ اعلیٰ ترین مقصد تک اسی تدریج کو ہی بنیادی اصول رکھنا پڑتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر فرد کے شعور کو بہ تدریج IMPROVE کیا جاتا ہے، تعلیم کے اس اصول سے انحراف خلاصہ، تشریح وغیرہ سے کیا جاتا ہے، لیکن اگر فرد کو واقعتاً علم منتقل کرنا مقصود ہو تو اس صورت کو ترک کرنا ضروری ہوگا، اگر میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ سے دریافت کروں کہ کیا آپ اس بات پر قادر ہیں کہ ۱۶ جماعت کے نصاب کی Text Book کو اس قدر آسان بنا دیں کہ اس سے ۱۰ ویں جماعت کا طالب علم پڑھ سمجھ سکے اور اپنے اندر ۱۶ ویں جماعت کے طالب علم کی سی اہلیت پیدا کر لے تو آپ یقیناً میرے اس مطالبے کا مذاق اڑائیں گے، کیونکہ یہ مطالبہ بالکل عبث اور بے نتیجہ ہے۔ گویا کوئی شخص یہ تصوّر ہی نہیں کر سکتا کہ فرد کے شعور کو متن کے مقصد کو سمجھنے کے لائق و قابل بنائے بغیر متن کے مقصد کا ابلاغ ممکن ہی نہیں ہوتا اور ویسے بھی ہر مصنف اپنی تصنیف سے قبل یہ فرض کر لیتا ہے کہ میرا مخاطب وہ افراد ہیں جن کا شعور اس قدر بالیدہ ہے جو اس کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں، برعکس اس کے تفسیر میں مقصد کو فرد کے شعور کی سطح تک لانے کی جدوجہد ہوتی، علاوہ ازیں تفسیر لکھ چکنے کے بعد مفسر اپنا فریضہ انجام دے لیتا ہے مفسر کی یہ ذمہ داری نہیں ہوتی کہ اس کی تفسیر کو قاری سمجھ لے، مفسر کی تفسیر کو سمجھنے کے لیے بھی تعلیم کی احتیاج مسلّم ہے۔ جبکہ معلّم اپنی ذمہ داری سے فقط اسی وقت عہدہ برا ہو سکتا ہے جب متعلم تک متن کو پہنچا نہ دے، تفسیر میں فرد کے شعور کو جوں کا توں چھوڑ دیا جاتا ہے اور مفسر کی جدوجہد کا رخ یہ ہوتا ہے کہ مقصد قرآن کو فرد کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ کر دیا جائے، مفسر اپنے مقصد میں فقط اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب فرد کے شعوری جمود کو بطور مسلّمہ قبول کر لیا جائے نیز یہ کہ قرآن پاک کو اس حد تک Reduce کرنا متصوّر ہو سکے۔

تعلیم کتاب نبی علیہ السّلام کا فرض منصبی ہے اور تفسیر کا مفسر کا فریضہ ہے، نبوی فریضے کا انجام دہی سے نتیجہ پیدا ہوتا ہے اور تفسیر سے قرآن پاک سے دوری کے سوا کچھ میسّر نہیں آتا۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com